پاک فوج کے شعرا

ڈاکٹر محمد افضال بٹ

Dr. Muhammad Afzaal Butt

Chairman, Department of Urdu,

G.C. Women University, Sialkot.

Abstract:

Poetry is considered the softest form of literature all over the world. It is astonishing fact that Pakistan Army, where, it has put forwarded its immense hard and non forgettable efforts for the defence of county, has also given evergreen poetry portion to urdu literature. Among all other poets of Pak Army, Syed Zameer Jafari, Shahzad Naeer, Faiz Ahmad Faiz and Ahmad Nawz are focussed in this artical.

پاک فوج کے اہلِ قلم حضرات نے ادب کے ہر شعبہ میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ ایسی ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں پاک فوج سے وابستہ رہیں جن کو ادبی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو شاعری میں بھی پاک فوج سے وابستہ شعرا نے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ ان میں سے چند ایک نمایاں شعرا کا تذکرہ ذیل میں ہے:

سید ضمیر جعفری

۱۲مئی ۲۰۱۹ء کے دِن سید ضمیر جعفری کو ہم سے بچھڑے ۲۰ برس گزر چکے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ اُن کا ذکر ہمہ وقت ذاتی محفلوں کے علاوہ تحریر و تقریر اور ادبی حوالوں سے زندہ ہے اور رہے گا۔ اس امر کی نشاندہی خود ضمیر جعفری صاحب نے اپنے ایک شعر میں یوں کی ہے:

ہمیں معلوم ہے دنیا میں اک دن ہم نہیں ہوں گے
مگر جو ہم پہ گزری ہے اسے دہرائے گی دنیا

اردو ادب میں ضمیر جعفری صاحب کی اہمیت ایک مزاح نگار شاعر کی حیثیت سے ہے مگر ان کے کمالِ فن کے بہت سے دوسرے پہلو بھی ہیں۔ انھوں نے نثر اور خاکہ نگاری میں بھی ایک جداگانہ انداز اپنایا۔ اس کے علاوہ سنجیدہ شاعری بھی کی۔ اُن کا مجموعہ کلام ''کھلیان'' سنجیدہ شاعری کا انتخاب ہے جو کہ اُن کی ۴۰ برس کی شاعری پر محیط ہے۔ لہٰذا اُن کی سنجیدہ شاعری اُن کی مزاح نگاری کی ہم رکاب رہی۔ اُن کی سنجیدہ شاعری نظموں اور غزلوں کا حسین اِمتزاج ہے جن میں مناظر فطرت کے علاوہ رنج و غم کا عنصر بھی بعض اوقات بہت نمایاں ہے جس سے ان کے اندرونی کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً:

غم کا درماں ڈھونڈتے ہیں محفل آرائی سے ہم
کتنے ناواقف ہیں اس دریا کی گہرائی سے ہم

مگر،اس اندرونی کرب کے باوجود وہ دنیا سے بیزار نہیں ہو پاتے۔ملاحظہ کریں:

درد میں لذت بہت ، اشکوں میں رعنائی بہت
اے غم ہستی ہمیں دنیا پسند آئی بہت

ایک اور جگہ فرماتے ہیں''کتنے آنسو پی گیا ہوں مسکرانے کے لیے''ان کے اس اعتراف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مزاح نویسی دراصل اندر کے دکھ درد اور اداسیوں کا ایک پردہ ہوتی ہے۔ان کی ہمہ جہت شخصیت ہماری قومی، ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ایک با محبت پاکستانی سرخرو نظر آتا ہے۔ان کی مطبوعہ تصنیفات کی تعداد۶۰ کے قریب ہے۔پھران کی ڈائریوں کا سلسلہ ہے اور اس کے علاوہ اُن کے کالموں کا مجموعہ ہے۔اردو کے مزاحیہ ادب میں وہ اکبرالہٰ آبادی کے بعد شاعری کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔انھوں نے مہذب اور برجستہ مزاح کی ایک بے مثال روایت کی بنیاد رکھی ہے۔شورش کاشمیری کہتے ہیں کہ:

> ''طبعاً مسلمان ہیں۔مسکراتے ہوئے الفاظ میں بھرپور طنز کرنے کا جو ڈھنگ اور رنگ انھیں آتا ہے اس سے سارے پاکستان میں، شاید ہی کوئی شخص بہرہ مند ہو۔زبان، بیان اور جان تینوں کے اعتبار سے وہ ایک ذیشان انسان ہیں۔''(۱)

ضمیر جعفری صاحب کی اپنے وطن کے لیے بے پناہ محبت نغموں کا مجموعہ''زبورِ وطن'' سے عیاں ہے۔روزنامہ ''احسان'' اور ہفت روزہ''شیرازہ'' کی ادارت سے لے کرا کادمی ادبیات کے رسالہ''ادبیات'' اور''اردو پنچ'' تک ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔اخباروں میں چھپنے والے یادگار کالم ان کی زندگی اور رخ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ان کے سفرنامے''کنگرو دیس میں''،''سورج میرے پیچھے'' اور''اوقیانوس کے پار'' اردو ادب کے شاہکار سفرنامے ہیں۔ان کی نثری تحریروں میں ان کی کتب''اڑتے خاکے'' اور''کتابی چہرے'' کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اپنے دور کے مشاہیر عالم شخصیات پر ان کے مضامین اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ان کی دیگر شخصیات پر خاکہ نما تحریریں ہمارے تنقیدی ادب کا زیور ہیں اور پھر اُن کی ڈائریاں اُن کے دور اور عہد کی بھرپور عکاس ہیں جن میں حالاتِ حاضرہ کے علاوہ اُن کے قلبی تاثرات قلم بند ہیں۔ان کی مزاحیہ شاعری میں بھی عصری تاریخ کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور وہ سادہ الفاظ میں گہری بات کہہ دینے کی مہارت رکھتے تھے۔مثلاً:

انا کیا عجز کو گرداب سمجھو
بڑا گہرا سمندر ذات کا ہے
خدا اشعارِ رسمی سے بچائے
یہ قتل عام سچی بات کا ہے(۲)

لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ضمیر جعفری ایک فرد کی نہیں ہماری قوم کے اجتماعی شعور کی کہانی ہے جو ملی درد اور قومی جذبوں

کی ایک داستان ہے۔ وہ ایک عہد کی طرح زندہ رہے اور اپنے پیچھے فکر و نظر کا ایک جہاں آباد کر گئے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے کیا خوب کہا کہ:

''ضمیر جعفری کو دیکھ کر کچھ اور زندہ رہنے کو جی چاہا کرتا تھا کہ زندگی کا حُسن اور محبت کی گہما گہمی اور شگفتگی اِس ایک شخص میں مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔ ضمیر محبتوں کا کروڑ پتی بھی ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کا جنریٹر بھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سیدھے جنت میں گئے ہوں گے۔'' (۳)

ان کے آخری کلام کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

محسوس کیا دستِ صبا کو نہیں دیکھا
دیکھا بھی خدا کو تو خدا کو نہیں دیکھا
آلام سے گھبرائیں گے کیا ہم ، کیا ہم نے
چشمہ کبھی پتھر سے نکلتا نہیں دیکھا

وہ اردو ادب کے ممتاز اور منفرد نثر نگار اور شاعر تھے۔ ان کی غزل بھی بہت پُر اثر ہے، لیکن ان کی مزاحیہ شاعری کو جو مقبولیت ملی اس نے ان کی نثر اور شاعری کی تمام اصناف کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ ان کی مزاحیہ شاعری جہاں اپنے موضوعات کے اعتبار سے منفرد ہے وہاں سادگی اور بے ساختہ پن کی بنا پر بھی ممتاز ہے۔ ضمیر جعفری کا کلام دورِ حاضر کے بہت سے مسائل کی ترجمانی کرتا دیتا ہے۔ ان کی شاعری ہلکے پھلکے انداز میں انتہائی سنجیدہ اور اہم مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے بہت کچھ سوچنے بلکہ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے:

شوق سے لختِ جگر ، نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

سید ضمیر جعفری ان لوگوں میں سے تھے جنہیں نثر اور شاعری دونوں اسلوب پر دسترس تھی، مزاح جیسی خوبصورت چیز کو انھوں نے اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا، ان کے مزاح میں کبھی پھکڑ پن کا احساس نہیں ہوتا۔

بس یہی فرق ہے نالج اور فالج میں
جیسے مرد چوکیدار لڑکیوں کے کالج میں

سید ضمیر حسین جعفری ضلع جہلم کے گاؤں چک عبدالخالق میں، یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سادات کے ایک روحانی گھرانے سے تھا جس کے کچھ مرد سپہ گری کے پیشے سے بھی وابستہ تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برطانوی ہند کی فوج میں بطور افسر شمولیت اختیار کی۔ رسالے اور چھاتہ برداری کے شعبوں سے وابستگی کے باوجود ان کی ادبی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انھیں فوج کے تعلقاتِ عامہ کے شعبے میں بھی کام کرنے کا موقع ملا جہاں اُن کی رفاقت میجر چراغ حسن حسرتؔ اور کرنل فیض احمد خاں (فیض احمد فیضؔ) جیسے عظیم ادیبوں سے بھی رہی۔ ضمیرؔ کی صنف مزاحیہ شاعری تھی لیکن اُنھوں نے نثر بھی بہت شگفتہ اور عمدہ لکھی۔ فوج میں رہ کر ہانگ کانگ، برما اور ملایا کے محاذوں پہ انگریزوں کی رفاقت میں گزارے ہوئے جنگ کے ماہ و سال اُن کے شعر و سخن پہ

بڑے دلچسپ انداز میں اثر انداز ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کے اسلوب میں انگریزی مزاج کا انداز ظرافت نمایاں تھا تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اُنہوں نے انگریزی، پنجابی اور اُردو کی شائستگی، برجستگی اور شگفتگی کو اس انداز میں یکجا کیا کہ اُن کے معاصرین میں، بلکہ اب تک، یہ امتیازی اسلوب کسی کے حصے میں نہیں آ سکا۔

جنگ کے بعد انھیں مستقل کمیشن کے امتحانات میں مسترد کر دیا گیا اور وہ کپتان ریٹائر ہو گئے۔ فرمایا کرتے تھے بھلا ہو شاستری کا کہ سن پینسٹھ کی جنگ چھڑ گئی اور فوج نے انھیں واپس بُلا کر میجر بنا دیا ورنہ عمر بھر گاؤں کے لوگ یہی سمجھتے رہتے کہ شاہ صاحب صوبیدار ہوں گے جنہیں انگریز نے اعزازی کپتان ریٹائر کیا تھا۔ قومی اسمبلی سطح کی سیاست میں بھی آئے لیکن سیاست ان کا مشغلہ تھا نہ پیشہ۔ غزل بھی کہی اور ناول اور افسانے سے بھی شغف کیا۔

سید ضمیر جعفری کی پہلی کتاب ''مافی الضمیر'' اُن کے کلام میں سب سے زیادہ مشہور ہوئی جس کی رنگا رنگ نظمیں اور اشعار زبان زد خاص و عام رہے، ''پُرانا کوٹ''، ''پُرانی موٹر'' اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں'' مجھے ذوقِ تماشہ لے گیا تصویر خانوں میں'' اور ''مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھیں یارو'' جیسی نظمیں اس کتاب کے قارئین اور اُردو مزاح کے وابستگانِ دامن کو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ غزلوں اور اشعار میں اس کتاب کی کچھ گُل فشانیاں تو ضمیر کے تعارف کا حصہ بنیں، فرمایا:

مُدتوں دُزدیدہ دُزدیدہ نظر سے دیکھنا
عشق بھی ہے اک طرح کی چور بازاری کا نام
اُس نے پہلے پہل کی پیمائشِ صحرائے نجد
قیس ہے دراصل اک مشہور پٹواری کا نام
دل ہو یا دلیہ ہو دانائی کہ بالائی ضمیرؔ
زندگی ہے چند اشیاء کی خریداری کا نام

ضمیر کا سیاسی اور تاریخی شعور جس خوبی سے شعروں میں ڈھلتا ہے، وہ شعر کی سی چاشنی، طنز کی تیزی اور کلام کی بے مثال برجستگی سے مرقع ہے۔ فرماتے ہیں:

نظر کی عیب جوئی، دل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے، بآسانی نہیں جاتی
مسلمانوں کے سر پہ خواہ ٹوپی ہو، نہ ہو لیکن
مسلمانوں کے سر سے بُوئے سُلطانی نہیں جاتی(۴)

ضمیر کا معاشرتی ادراک اور سیاسی بصیرت مزاح میں اکبرالہ آبادی یا حالؔی کی طرح مربیانہ زبان رکھتا ہے۔ ان کا انداز ایسے ہے کسی پھاٹک پر بیٹھے چوکیدار، گلی میں جاتے پنشنر، کسی بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان سے گفتگو اور اس میں پھلجھڑیاں چھوڑتے جا رہے ہوں۔

نظم کے ایک قطعے میں ریل کے سفر پر آنے والے دیہاتیوں کے زادِ راہ کا ذکر کرتے ہیں:

وہ سارے کھیت کے گنے کٹا لایا ہے ڈبے میں
یہ گھر کی چارپائی تک اُٹھا لایا ہے ڈبے میں

شعر میں الفاظ کے استعمال میں جو ملکہ اُنھیں حاصل تھا، وہ اُن کی انفرادیت تھی۔ الفاظ کا انتخاب اس ضمن میں کمال ہی کرتے ہیں۔ مثلاً 'مجھے ذوقِ تماشہ لے گیا تصویر خانوں میں' کے آخری اشعار میں جس انداز سے اُنھوں نے پکچر دیکھنے والے لوگوں کی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ ہو:

اُدھر ایک طائفۂ فلم اسٹاران می رقصد
اِدھر اصحابِ بے ٹکٹان و باٹکٹان می رقصد

معاشرتی رویوں پر بھی خوب لکھا اور سیاست اور زبوں تر مُلکی حالات کی طرف رُوئے سُخن کیا تو ''مسدس بدحالی'' جیسی کمال کتاب سامنے آئی۔ ضمیر نے سیاسی طنز میں بھی اپنا ایک منفرد اور شائستہ اسلوب قائم رکھا۔ ''مسدس بدحالی'' سے ایک رُباعی:

یہ انگریزوں کی صدیوں سے بڑی مشہور عادت ہے
دریدہ بھی اگر دامن ہو ، نکٹائی نہیں جاتی
روش اپنی بھی اک پُختہ ہوئی طرزِ سیاست میں
حکومت تو چلی جاتی ہے ، مہنگائی نہیں جاتی

ضمیر نے جہاں غریب آدمی کی آواز کو اپنے ترنم جیسے اسلوب میں بیان کیا وہاں امیر اور بالا دست طبقے کے منافقانہ رویوں پر بھی خوب طنز کے کوڑے برسائے:

وہ جو بچہ پڑھ رہا ہے ٹاٹ کے اسکول میں
پھول وہ بھی ہے مگر پھینکا گیا ہے دھول میں
راستے میں خود کھڑی کیں ہم نے دیواریں بہت
فاصلہ اتنا نہ تھا چکوال اور کاکُول میں!

ضمیر کے مزاحیہ اندازِ کلام کا ایک خاصہ یہ ہے کہ شعروں میں خاکے لکھنے کا فن اُردو میں ان جیسا کسی کے پاس نہ تھا۔ اُن کے شعروں میں 'موٹے بدری ناتھانِ وطن، چھوٹے چھوٹو رامانِ وطن' جیسے مقامی اور 'مسز ولیم' جیسے کئی بدیسی کرداروں کے خاکے ملیں گے۔ یہ صنف شاید بلاواسطہ اُن کے انگریزی ادب کے ذوق کی پیداوار ہو۔ ضمیر نے کہیں مصرعوں میں لوگوں کی پوری ذات اور زندگی کے خلاصے کہہ ڈالے ہیں اور کہیں پوری پوری نظموں میں مزے لے لے کر اپنے کرداروں کی جزئیات بیان کی ہیں۔

جہاں ہم اُن کی کتابوں اور نثر پاروں کی فہرست دیکھتے ہیں تو اس میں ایک نام آتا ہے 'گورخند' کا جو بظاہر ایک مجموعہ ہے شعری تراجم کا لیکن حقیقت میں ضمیر نے اُردو کی مزاحیہ شاعری میں ایک نئی صنف متعارف کروائی ہے جس میں اُن قادرالکلامی کا ثبوت بھی اسی کتاب میں ہے۔ انگریزوں کے ہاں Grave Humour ایک صنف ہے جس میں قبروں کے کتبوں کی شگفتہ اور برجستہ تحریریں آتی ہیں۔ ضمیر نے اس اصطلاح کا ترجمہ ''گورخند'' کیا۔ جان ڈرائیڈن کا یہ شعر جو اُس کی بیوی کی قبر کے کتبے کے لیے تھا، مشہور ہے:

!lie her let here :wife my lies Here

I am so and rest at she's Now

ضمیرؔ نے اس شعر کو اُسی انداز میں اُردو میں ڈھالا ہے لیکن کئی جگہوں پر ضمیرؔ کی اُردو گورخند انگریزی کی Grave Humour سے آگے نکل جاتی ہے:

میری زوجہ قبر میں سوئی ہے جن ایام سے
وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

ضمیرؔ نے عام آدمیوں، ناکام لوگوں، فن کاروں اور سپاہیوں کی قبروں کے کتبوں کی تحریروں کی صورت میں گورخند کا ایک بیش بہا خزانہ اس کتاب کی صورت میں چھوڑا ہے۔ ضمیرؔ کی اولاد میں اُن کے صاحبزادے لیفٹیننٹ جنرل سید احتشام ضمیر جعفری اُن کے فوجی اور ادبی ترکے کے وارث ہیں۔ جنرل احتشام خود بھی لکھاری ہیں۔

ضمیر صاحب بھی خوب تھے، کہیں نثر میں نمایاں ہوئے تو کہیں نظم میں، کبھی دوستوں کے ضمیر جعفری ہوتے تو کبھی ٹی وی ناظرین کے لیے ''آپ کا ضمیر'' کے میزبان، کبھی مزاحیہ شاعر اور کہیں بے بدل مزاح نگار۔ وہ ضمیر حاضر ہوتے یا ضمیر غائب، دونوں صورتوں میں تقریبات اور دلوں میں موجود ہوتے۔ وہ اپنے سادہ، مخلصانہ لہجے، عمدگی سے مزاح میں پروئے لفظوں، جملوں، کھلکھلاتے، شرارتیں کرتے اشعار اور دوستوں کے ساتھ مضبوط تعلق کے باعث عمر بھر اپنے وجود کی طرح نمایاں رہے۔

سید ضمیر جعفری کا بچپن اور جوانی چونکہ اس گاؤں اور وادی میں گزری اسی لیے وہ بھی عمر بھر دھیرے دھیرے بہنے والے دریا کی طرح گاتے، گنگناتے رہے۔ اس وادی کا پھیلاؤ اور وسعت ان کے لفظوں، تعلقات اور سوچوں میں نمایاں رہی۔ جس قدر میٹھے اور کھلے دل والے ضمیر جعفری صاحب تھے شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ شاعری ان پر اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے اترتی تھی۔ سننے والے کبھی ان اشعار پر مسکرا دیتے، کبھی کھلکھلا کر قہقہہ لگاتے، ہاں کبھی کبھی سنجیدہ اشعار کا موڈ ہوتا تو وہاں بھی ان کی فکری موجودگی ان کے وجود کی طرح نمایاں رہتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ دل اور مشاعرہ دونوں ہی آسانی سے لوٹ لیتے تھے۔

''ضمیر کے ساتھ ساتھ'' کے عنوان سے کتابیں سید ضمیر جعفری کی ''ذاتی ڈائریوں'' پر مشتمل ہیں۔ اپنی اس نثری سیریز کے بارے میں آپ یوں رقم طراز ہیں:

> میں ستمبر ۱۹۴۳ء سے تقریباً روزانہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ شب کو ڈائری لکھ کر ہی بستر پر جاؤں، خواہ ایک سطر ہی لکھوں۔ کوئی رت جگا آ پڑے تو اگلی صبح پہلا کام یہی کرتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں میرے دماغ میں یہ ''کیڑا'' کیوں پیدا ہوا اور میں حیران ہوں کہ مجھ جیسا ''چست'' گزشتہ پچاس پچپن برس سے اس ''کیڑے'' کی پرورش کیسے کرتا ہے۔ اتنی استقامت کا مظاہرہ میں نے ذاتی زندگی کے کسی معاملے میں شاید ہی کیا ہو۔

شروع میں کئی برس تک، پولیس تھانوں کے روزنامچوں کے سے تن وتوش کا رجسٹر اس کارروائی کا تختۂ مشق رہا۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا اس دفتر کا، جو تہہ بہ تہہ جمع ہوتا جا رہا تھا، کوئی مصرف بھی ہوگا۔ یہ شاید ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے ممتاز شاعر عبدالعزیز خالد میرے ہاں تشریف لائے تو ڈائریوں کی قطار دیکھ کر انھوں نے پوچھا:

''اِن میں کیا ہے؟''
میں نے عرض کیا:
راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی''
انھوں نے دریافت کیا:
آخر اس درد کی دوا کیا ہے''
''دوا'' بھی انھوں نے ہی تجویز کی۔''اس ذخیرے کی چھانٹی کرو۔منتخبات کو چھپواؤ۔اس متاع کو ٹھکانے لگاؤ۔کس کے گھر جائے گا یہ سیل بلا تیرے بعد''

میں اگر چہ اندر سے متذبذب تھا کہ اس ملبے میں نہ تاریخ ہے نہ ادب۔ان لمحاتی جذبوں، اضطراری حالتوں میں سر پٹ لکھی ہوئی تحریروں کی اشاعت کہیں میری عاقبت ہی نہ خراب کر دے مگر خالد صاحب کے تجربے اور دانش کو بھی نظر انداز کرنا مشکل تھا جبکہ مشورہ بھی مجھے موافق آرہا تھا۔سو میں نے ایک سابق فوجی کے ناتے سب سے پہلے اس کی نکاسی کے لیے ایک فوجی محاذ یعنی عسا کر پاکستان کے ہفتہ روزہ اخبار''ہلال'' کو منتخب کیا۔جس میں''ضمیر حاضر،ضمیر غائب'' کے عنوان کے تحت ان ڈائریوں کے اقتباسات کچھ عرصہ شائع ہوتے رہے۔ان ڈائریوں میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری خوب کام لیا گیا ہے اور قاری ضمیر جعفری کے ساتھ ساتھ زندگی گزارتا محسوس کرتا ہے۔

گاڑی جھانسی جنکشن پر رکی ہوئی ہے۔یہ ایک اہم فوجی چھاؤنی ہے۔ریلوے اسٹیشن پر بڑی چہل پہل ہے۔فوجی چڑھ اور اتر رہے ہیں۔ریلوے اسٹیشنوں پر فوجیوں کے لیے مفت چائے پانی کی''کینٹینیں'' تو عام ہیں۔جھانسی کی ایک رائے بہادر نے فوجیوں کے لیے کھانے کا لنگر کھول رکھا ہے۔(۵)

سید ضمیر جعفری کی ان ڈائریوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہ اشاعت کے خیال سے لکھی ہی نہیں گئیں۔یہ تو وہ باتیں ہیں جو مصنف اپنے ساتھ خود کرتا رہا البتہ ہمارے عہد کے اس صاحبِ اسلوب اور محبوب و مقبول مزاح نگار نے اس بے تکلف دوڑتی ہوئی تحریر کو بھی اپنے مخصوص زعفرانی انداز میں گلابی اور شہابی بنا دیا ہے۔بظاہر یہ ایک شخص کی زندگی کی روداد ہے مگر اس ایک راستے سے زندگی کی ہزاروں پگ ڈنڈیاں نکلتی چلی گئی ہیں۔یہ ذاتی تاثرات کی وہ بے خراش''لمحاتی سچائیاں'' ہیں جو ہمارے ملک کے ایک ممتاز دانش ور اور اُردو زبان کے منفرد مزاح نگار کی نصف صدی کی خود نوشت میں بکھری پڑی تھیں۔پروفیسر صدیق کلیم کا کہنا ہے:

''سید ضمیر جعفری کو مزاحیہ شاعری کی زبان پر قدرت کامل حاصل ہے۔ان کی شاعری عوامی ماحول کی شاعری ہے۔''(۶)

مزاح کے ذیل میں تحریف نگاری ایک توانا حربہ ہے۔اس حربے کو استعمال کرتے ہوئے خوبصورت تحریفات سے دامنِ ادب کو گلنار کیا ہے۔دو عیدوں کا مسئلہ پوری قوم کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔''رویت ہلال کمیٹی'' چاند کی طرح صرف عید بقرِ عید پر اپنا دیدار کرا کے اور قوم کو مخمصے میں ڈال کر رفو چکر ہو جاتی ہے۔اس جھگڑے کو ضمیر جعفری نے''دو عیدیں'' کے عنوان سے لکھا:

مولوی صاحب کھڑے ہو کر کسی مینار پر
اپنی چشمِ سرگیں کی کوشش بسیار سے
چاند پیدا کر ہی لیتے تھے بہ جہدِ جستجو
ابر کے گھمسان ، گہرے بادلوں کے غار سے(۷)

ان ظریفانِ فن کے فکاہیہ کلام میں قوس قزح کے رنگ، پھولوں کی خوشبوں کی مہک، کونپلوں کے پھوٹنے اور کھلنے تک کیفیات، مزاح اور بذلہ سنجی کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کی فکاہیہ شاعری زندگی کے تجربات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ یہ حالاتِ زمانہ کواحساسات اور جذبوں میں ڈھال کر قہقہوں کے گلشن زار میں پہنچادیتے ہیں۔

اردو کی ظریفانہ شاعری کا یہ آفتاب ۱۶ مئی ۱۹۹۹ء کو غروب ہو گیا۔ان کی وفات سے اردو کی ظریفانہ شاعری کا ایک عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔ان کی شاعری انھیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند مقام پر فائز کرے گی۔لوح جہاں پر ان کا نام ہمیشہ ثبت رہے گا۔ وہ ایک عظیم الشان شعری روایت کے موجد تھے۔ان کی وفات کے ساتھ ہی اردو شاعری میں طنز و مزاح کی ایک درخشاں روایت نئی نسل کو منتقل ہو گئی۔

شہزاد نیّرؔ

شہزاد نیّرؔ کا اصل نام محمد شہزاد جب کہ قلمی نام شہزاد نیّرؔ ہے۔نیّرؔ ان کا تخلص ہے جب کہ گھر میں سب پیار سے شاد کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ان کے والد کا نام محمد رفیق جبکہ والدہ کا نام صغریٰ بی بی تھا۔ان کا تعلق گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں گوندلانوالہ سے ہے۔ان کے آباؤاجداد زراعت کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ایوب خان کے دور میں یہ خاندان صنعتوں کے شعبے سے منسلک ہو گیا۔شہزاد نیّرؔ کے والد صاحب کو فیکٹری ملازمت میں شدید محنت اور کڑے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں وہ خود ایک لوہے کی فیکٹری کے مالک بنے۔۲۹ مئی ۱۹۷۳ء کو شہزاد پیدا ہوئے۔ چھے بہن بھائیوں میں شہزاد دوسرے نمبر پر ہیں۔ شہزاد نیّرؔ بچپن ہی سے ذہین ہیں۔سکول کالج میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے۔ پروگراموں کی میزبانی کرتے۔ بزم ادب میں پیش پیش رہتے۔اور فٹ بال ٹیم میں بھی شامل تھے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے انسان کی شخصیت نکھرتی ہے۔شہزاد نیّرؔ زندگی کی کڑی دھوپ چھاؤں دیکھنے کے بعد ادبی منظرنامے پر کندن بن کر ابھرے۔ بقول شہزاد نیّرؔ:

> ''شہری اور دیہاتی زندگی کے گہرے تضاد کے ساتھ ساتھ امیری غریبی کے تضاد کا بھی شدید احساس ہوا۔۔۔۔حالات کی تبدیلی کے سبب جس متضاد صورت حال کا شکار ہوا تھا۔اس نے مجھے بہت حساس بنا دیا۔میرا مطالعہ کا رجحان بڑھ گیا۔ میں فلسفہ کی طرف راغب ہو گیا۔'' (۸)

۱۹۹۱ء میں ایف ایس سی کے بعد بی ایس سی میں داخلہ لیا۔لیکن فوج میں منتخب ہو جانے پر بی ایس سی ادھوری چھوڑ کر ۱۹۹۳ء میں فوج میں شامل ہو گئے۔ پاک فوج میں شمولیت شہزاد نیّرؔ کا شوق اور جنون تھا۔۱۹۹۵ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ مکمل کر کے کوہاٹ آ گئے۔ اسی دوران میں فوج کے محکمانہ اور پروفیشنل کورسس بھی کیے۔۲۰۱۴ء میں نمل یونی ورسٹی سے فارسی میں ڈپلومہ کیا۔اور فوج میں توپ خانے کی فلیڈ رجمنٹ سے وابستہ ہوئے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی سے پاس آؤٹ

ہونے کے بعد ۱۹۹۶ء میں والدین کی پسند سے شہزاد نیئر نے شادی کی اور پھر اپنی پسند سے دوسری شادی پڑھی لکھی لڑکی سے کی۔ پہلی بیوی ''ریحانہ'' سادہ طبیعت اور گھریلو خاتون تھیں جن سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہو پائی۔۲۰۰۴ء میں سیما فردوس کو ہم مزاج پایا اور انھیں شریکِ سفر بنالیا۔۲۰۱۴ء میں پہلی بیوی سرطان میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں۔ شہزاد نیئر کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

متعدد ادبی جرائد مثلاً فنون، اوراق، معاصر وغیرہ میں آپکا کلام شائع ہوتا رہا۔ آپ ملکی و غیر ملکی ادب کے پُر شوق قاری ہیں۔ برطانیہ، فرانس، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے یادگار بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت کی۔ ادبی تنقید اور لسانیات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادبی تنقید پر آپ کے متعدد مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

فوج جیسے ذمہ دارانہ شعبے سے منسلک اور اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود انور مسعود، خالد مسعود، عباس تابش اور جلیل عالی جیسے شعرا کے ساتھ اردو شعر و ادب کے فروغ کی خاطر مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ شہزاد نیئر فیض، غالب اور ن م راشد کی شاعری کو سراہتے ہیں۔ انھیں لسانیات پر بھی عبور حاصل ہے۔۲۰۱۳ء میں انھوں نے اپنے گاؤں میں اپنی مدد آپ کے تحت ایک پبلک لائبریری قائم کی۔ احمد ندیم قاسمی کے رسالہ ''صحیفہ'' میں ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں اس کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں جن کو سامنے رکھ کر وہ اپنی زندگی کے اصول و ضوابط مرتب کرتا ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ذہنی آسودگی کے لیے مزید مشاغل بھی اپناتا ہے۔ شہزاد نیئر فوجی آفیسر ہونے کے باعث مصروف زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر تمام مصروفیات کے باوجود شاعری اور مطالعہ ان کا اہم اور بنیادی مشغلہ ہے۔ اردو، فارسی، انگریزی ادب، غیر ادب، تاریخ، فلسفہ، مذہبی متون، احادیث، بائبل، بدھ مت ان سب کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ شہزاد نیئر کا شمار ۹۰ کی دہائی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت کم وقت میں ترقی کی منازل طے کیں۔ نوجوان نسل میں جو مقام انھیں حاصل ہوا وہ شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوگا۔

وہ اردو شاعری میں ایک اہم نام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ شہزاد نیئر کا پہلا مجموعہ ''برفاب'' ہے۔ جس نے کامیابی کے ریکارڈ بنائے۔ پانچ سال میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے کو Award International Pen بھی مل چکا ہے۔ برفاب کا بیشتر حصہ سیاچن کے قیام کے دوران لکھا گیا ہے۔ وہ بطور کیپٹن سیاچن میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہاں کے تجربات کو اپنی نظموں میں خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ امجد اسلام امجد شہزاد نیئر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ شہزاد نیئر کی بیشتر شاعری سیاچن کے علاقے کی ہے۔ اور یہ ''علاقہ'' موضوع کے ساتھ ساتھ معیار کا بھی احاطہ کرتا ہے۔۔۔۔ انہیں نظم کی بنت کا فن آتا ہے۔۔۔ اور وہ اندرونی قافیوں اور مترنم بحروں کی مدد سے اپنی نظم میں وہ خصوصیت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں جو قاری کو اپنے سحر میں لے کے نظم کی آخری لائن تک اپنے ساتھ چلاتی ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں سیاچن کے تجربے کے باعث ایک ایسی امیجری در آئی ہے جس کی مثال اُردو شاعری میں بہت مشکل سے ملے گی۔۔۔ انھوں نے برف میں ایسے خوش رنگ پھول کھلائے ہیں جن سے اُردو نظم کی فضا یقیناً معطر اور دلکش ہو گئی

ہے۔۔۔۔‘‘(۹)

برفاب کے علاوہ ان کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔جن میں ’’چاک سے اترے وجود‘‘، ’’گرہ کھلنے تک‘‘ اور ’’خوابشار‘‘ شامل ہیں۔خوابشار ان کا غزلیات پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ان کی نظموں کی طرح غزلیں بھی جدیدیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔شہزادنیّر کو مندرجہ ذیل ایوارڈ دیئے گئے۔صوفی غلام مصطفٰی تبسم ایوارڈ،فیض امن ایوارڈ،ایوانِ اقبال ایوارڈ دُبئی، پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ ۲۰۰۹ء اس کے علاوہ بہت ساری ادبی تنظیموں کی طرف سے لاتعداد اعزازی شیلڈز اور ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے۔

عصرِ حاضر میں زود گو شعرا کے جمِ غفیر میں اپنی ایک الگ پہچان بنانا بہت ہی مشکل کام ہے لیکن شہزادنیّر نے یہ مشکل کام بہت آسانی سے کرلیا ہے۔بہت کم عرصے میں شہزادنیر نے اپنی تخلیقی توانائیوں کا لوہا منوا کر اردو شاعری میں ایسا مقام بنالیا ہے جس کی تمنا بہت سے شاعر ساری عمر کرتے رہتے ہیں مگر وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جو شہزادنیر صاحب نے بہت کم عمری میں حاصل کرلیا ہے۔شہزادنیّر کی شاعری کا ایک اور بہت ہی خوبصورت پہلو یہ ہے کہ میجر شہزادنیّر نظم اور غزل بیک وقت ان دونوں اصناف میں اپنے فن کا لوہا منوار ہے ہیں۔ان کی طویل نظموں ’’خاک‘‘، ’’سیاچن‘‘ اور ’’نوحہ گر‘‘ نے شہرۂ آفاق مقبولیت حاصل کی۔

سنجیدہ ادبی حلقوں میں شہزادنیر کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ان کی نظم یا غزل کا اپنا ایک منفرد لہجہ اور مزاج ہے جو انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ان کی شاعری پر درجنوں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔صرف برفاب پر ہی اب تک چالیس مقالے لکھے ہیں۔شہزادنیر کے بارے میں احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> "شہزادنیر نوجوان شاعر ہیں مگر انھوں نے نوجوانی ہی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔وہ دونوں اصنافِ شعر،نظم اور غزل کو سلیقے سے برتتے ہیں۔اُن کا جوہر بیشتر ان کی نظموں میں کھلتا ہے اور وہ اپنے آس پاس کی صورتِ حال کا مطالعہ بہت ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ کرتے ہیں اور اس مطالعے کے فنکارانہ اظہار میں کوئی بھی مصلحت ان کی مزاحم نہیں ہوتی۔چنانچہ ان کی شاعری کا نمایاں تاثر صداقت اور حقیقت ہے۔وہ خواب بھی یقیناً دیکھتے ہیں۔مگر ان خوابوں کو بھی ماورائیت کے سمندر میں ڈوبنے سے بچائے رکھتے ہیں اور یہ بہت بڑی خوبی ہے۔۔۔۔۔۔‘‘(احمد ندیم قاسمی)(۱۰)

میں چُپ رہتا تو بچ سکتی تھی گردن
مگر یہ فطرتِ بے باک میری
مجھے ہی بھوک میں کھانے کو دوڑے
تمنّا اس قدر سفاک میری
مرے پہلے گناہ کے بعد نیّر
بہت روئی سرشتِ پاک میری

اور یہ شعر تو مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ گیا:

اس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے اُدھر سے
دکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا

فیض احمد فیض

فیض صاحب گو دوسری عالم گیر جنگ کے دوران فوج کے تعلقات عام کے شعبہ میں کام کرتے تھے اور انھیں لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ بھی ملا تھا لیکن اس بات پر ان کے رفیق اتفاق کرتے ہیں کہ وہ کوئی اعلیٰ منتظم نہیں تھے البتہ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ نہایت کامیاب شخص تھے۔ان میں سب سے بڑا ہنر اپنے ماتحتوں میں اپنے دھیمے نرم اور ملائم انداز سے ایسا اعتماد اور وجدان پیدا کرنے کا تھا کہ کوئی کام ان کے لیے ناممکن نہیں رہتا تھا۔ وہ بلاشبہ خوش قسمت تھے کہ انھیں مولانا چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، ایوب کرمانی، سید سبطِ حسن، حمید ہاشمی اور ظہیر بابر جیسے ساتھی ملے۔ایک کہکشاں تھی جواب ناپید ہے۔

آپ نے فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔دوسری جنگ عظیم سے دور رہنے کے لیے آپ نے اپنے لیے محکمۂ تعلقات عامہ میں کام کرنے کا انتخاب کیا۔آپ فوج میں جنرل اکبر خان کے ماتحت ایک یونٹ میں بھرتی تھے۔جنرل خان بائیں بازو کے سیاسی خیالات رکھتے تھے اور اس لیے آپ کو خوب پسند تھے۔۱۹۴۳ء میں فیض میجر اور پھر ۱۹۴۴ء میں لیفٹیننٹ کرنل ہوئے۔۱۹۴۷ء میں پہلی کشمیر جنگ کے بعد آپ فوج سے مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔

ہر دور میں ایک نہ ایک آواز ایسی ضرور ابھرتی ہے جسے کوئی بھی صاحب دل اور اہل شعور نظر انداز نہیں کر سکتا۔جس کا تاثر وسیع بھی ہوتا ہے اور دوررس بھی۔آج کے دور میں یہ آواز فیض کی آواز ہے۔جہاں جہاں مظلوم انسانیت کے دکھوں کا شعور موجود ہے۔یہ آواز اپنے گہرے تاثر کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔بلاشبہ اردو شاعری کا عہد نو فیض کا عہد ہے اور فیض سے شناسائی کے بعد رہائی کی کوئی صورت نہیں۔

سن انیس سو اٹھاون میں جب ایوب خان نے ملک کے اقتدار پر قبضہ کیا تو اس وقت فیض صاحب ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے سویت یونین گئے ہوئے تھے۔ملک کے حالات کے پیش نظر ان کے دوستوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ پاکستان نہ جائیں لیکن انھوں نے یہ مشورہ نہ مانا اور وہ وطن لوٹے جہاں انھیں بغیر کسی الزام کے فی الفور گرفتار کر لیا گیا۔وہ چار ماہ قید رہے اور متواتر پوچھ گچھ کا نشانہ بنے۔اس قید سے رہائی کے بعد انھوں نے یہ قطعہ لکھا:

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا وہ سامنے لائے رکھتے ہیں
دامن میں ہے مشت خاک جگر ، ساغر میں ہے خون حسرت مہ
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام الٹائے دیتے ہیں

پھر ایوب خان کی مارشل لا حکومت نے سیکرٹری الطاف گوہر اور بریگیڈیئر ایف آر خان کی سفارش پر ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ''لیل ونہار'' پر قبضہ کر لیا اور اعلیٰ درجہ کے ادارہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔میاں افتخار الدین اس ادارہ کی ملکیت سے محروم ہو گئے، فیض صاحب اپنی چیف ایڈیٹری ہاتھ سے کھو بیٹھے اور عوام آزاد اور ترقی پسند اخبارات سے تہی دست ہو گئے۔

فیض صاحب سن انیس سو اٹھتر سے انیس سو بیاسی تک جلا وطن رہے۔اس دوران بیشتر عرصہ انھوں نے لندن میں

گزارا۔۲۳ فروری ۱۹۵۱ء کو چیف آف جنرل سٹاف، میجر جنرل اکبر خان کے گھر پر ایک خفیہ ملاقات کا انعقاد ہوا۔ اس ملاقات میں دیگر فوجی افسران بھی سجاد ظہیر اور فیض کے ساتھ، شامل تھے۔ یہاں موجود اِن سب لوگوں نے لیاقت علی خان کی گورنمنٹ کو گرانے کا ایک منصوبہ تجویز دیا۔ یہ سازش بعد میں راولپنڈی سازش کے نام سے جانی جانے لگی۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے۔۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں معاونت کے الزام میں حکومتِ وقت نے گرفتار کرلیا۔ آپ نے چار سال سرگودھا، ساہیوال، حیدرآباد اور کراچی کی جیلوں میں گزارے؛ جہاں سے آپ کو ۱۲ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا کر دیا گیا۔ ''زنداں نامہ'' کی بیشتر نظمیں اسی عرصہ میں لکھی گئیں۔ رہا ہونے کے بعد آپ نے جلاوطنی اختیار کر لی اور لندن میں اپنے خاندان سمیت رہائش پذیر رہے۔ فیض نے جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہوئے ایک شعر میں کہا:

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹس کونسل میں بطورِ سیکرٹری تعینات ہوئے اور ۱۹۶۲ء تک وہیں پر کام کیا۔ ۱۹۶۴ء میں لندن سے واپسی پر آپ عبداللہ ہارون کالج کراچی میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔

فیض کی شاعری کی اصل خوبی ان کا وہ پیرایہ اظہار ہے جس میں تغزل کا رنگ و آہنگ تہہ نشین ہوتا ہے۔ یہی طرز بیان ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ تعبیرات کی ندرت اور تشبیہوں کی جدت اس کے اہم اجزا ہیں۔ ان کی نظموں میں ایسے ٹکڑے جن میں اجزاء سلیقے کے ساتھ یکجا ہو گئے ہیں۔ واقعتاً بے مثال ہیں۔ بیان کی شگفتگی ایسے اجزاء میں درجہ کمال پر نظر آتی ہے اور پڑھنے والا کچھ دیر کے لیے کچھ کھوسا جاتا ہے:

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

وطن پرستی

فیض کو اپنی مٹی سے پیار ہے۔ اس مٹی کو وہ محبوبہ کی طرح چاہتے ہیں۔ محبوبہ اور وطن میں وہ فرق نہیں کرتے:

چاہا اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہیں یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

لیلائے وطن سے محبت فیض کی نظموں کا ایک مستقل موضوع ہے وہ جابجا اپنے محبوب دیس اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ دیکھ کر بے طرح تڑپ اُٹھتے ہیں۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے ، جسم و جاں بچا کے چلے

فیض کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ جیل کی زندگی نے اس محبت کو اور بھی جلا بخشی، جیل، جہاں انسان سے اس کی مرضی چھین لی جاتی ہے، فیض کے لیے سوہان روح تھی۔ وہ جیل کی اندھیری کوٹھڑی میں وطن کا تصور کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

آزادی سے پہلے فیض نے بھی آزادی کے خواب دیکھے تھے اور اپنے تصور میں وطن کی صورت میں ایک جنت آباد تھی مگر جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو تمام حالات یکسر تبدیل نہیں ہوئے اور نہ فوراً ہو سکتے تھے۔ فیض نے اسے ''شب گزیدہ سحر'' اور ''داغ داغ اجالا'' سے تعبیر کیا ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

مگر اس کے باوجود فیض مایوس ہو کر نہیں بیٹھے بلکہ ابنائے وطن کو جدوجہد جاری رکھنے اور آگے بڑھنے کا مشورہ دیا:

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

احمد نواز

عہدِ حاضر میں اُردو شاعری کی مختلف اصناف میں جاری گراں قدر کام نے اس مقبول زبان کے حسن اور وسعتِ ظرف میں مزید اضافہ کیا ہے۔ موجودہ شعری ماحول میں آج کے نوجوان شعراء اپنی تخلیقیت اور تازہ کاری کے باعث اپنی موجودگی کا مسلسل احساس دلا رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک توانا اور خوش کن آواز احمد نواز کی ہے کہ جسے محض اس کے شعر کی بنیاد پر سنجیدہ ادبی حلقوں کی خاطر خواہ توجہ اور زبردست پذیرائی ملی ہے۔ اس نے اپنے اشعار کی دلکش بُنت، خیال کی بندش، مصرع سازی، زبان کے تخلیقی استعمال، حسنِ تغزل، لطفِ بیان، معنویت، تازہ کاری، تلازمہ، متنوع اور جاندار مضامین اور عصری شعور کی عمل داری سے اربابِ سخن کی نظر اور دل میں جگہ بنائی ہے۔

احمد نواز ۲۱ اگست ۱۹۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع چکوال سے ہے۔ ان کے والد بھی فوجی ملازمت اور زمین داری کرتے تھے۔ پرائمری تک چکوال کے گورنمنٹ سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد میٹرک

فوجی فاؤنڈیشن کالج راول پنڈی سے کیا۔ اس کے بعد گریجوایشن پاکستان ملٹری اکیڈمی اور ماسٹرز کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ سے کیا۔

پیشے کے لحاظ سے وہ دفاعِ وطن سے وابستہ ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں پاک فوج میں شمولیت اختیار کی۔ آج کل ان کی تعیناتی راول پنڈی میں ہے اور وہ میجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ میجر احمد نواز نے شاعری کا آغاز ۷۰۔۲۰۰۶ء میں کیا۔ انہیں شہزاد نیرؔ، علی مزمل مرحوم اور رحمان حفیظ جیسے اساتذہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ان کا ایک شاعری کا مجموعہ ''اشک گویا'' ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا اور دوسرا شاعری کا مجموعہ ''آٹھواں رنگ'' جلد ہی طباعت کے مراحل سے گزرنے والا ہے۔ وہ ایک خوبصورت شاعر اور اُنس بانٹنے والے منکسر المزاج انسان ہیں۔ لفظوں کو برتنے کا فن اسے خوب آتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات ہوں یا جمالیات۔۔ احمد نواز کے لیے کچھ بھی نیا نہیں۔

وہ ایک ایسا پختہ کار اور جدت شعار شاعر ہے کہ جس کا اپنا مخصوص رنگ اور منفرد انداز ہے. اس کے ہاں تخیل کی بلندی، فکر کی گہرائی اور گیرائی، خیال کی رنگینی اور جذبات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ ایسی حسین اور حسِ لطیف سے مملو شاعری یقیناً اس کی ذات کے حسن اور لطافت کی آئینہ دار ہے۔

احمد نواز کی شاعری کے کینوس پر مختلف دلآویز مضامین دیدہ زیب رنگوں کی صورت پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں محبت، احترامِ آدمیت، عرفانِ ذات، جستجوئے خدا، فلسفہ، تصوّف، نفسیات، قلبی اور روحانی تجربات، رومانویت، ہجر و وصل کی کیفیات و تجربات، دنیا کی بے ثباتی اور مابعد الطبیعات کے مضامین کے علاوہ سماجی اور عصری مسائل شامل ہیں۔ وہ ایک دردمند دل کی آنکھ سے دنیا کو دیکھتا ہے اور پھر اپنی شاعری کے ذریعے اپنے مشاہدات اور احساسات کو ورود بخشتا ہے۔ ذات سے کائنات اور کائنات سے ذات تک کے سفر میں وارداتِ قلبی کو بیان کرنے کی لگن اس کے اندر کے شاعر کو اظہار پر اکساتی ہے۔ وہ راہگزارِ ہستی میں ''میں'' کی رکاوٹ کو عبور کر کے محبت کی کھلی فضا میں محوِ پرواز نظر آتا ہے۔ اس کا شعری اظہار یہ داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ شعری محاسن اور جدید شعری حسیات کا بخوبی ادراک رکھتا ہے۔ شعر گوئی کے عمل کے دوران گویا اسے اپنی ذات کی پرتیں دریافت ہوتی نظر آتی ہیں، جو اس کی جستجو کو اور بھی مہمیز کرتی ہیں اور یوں وہ دائمی سرشاری سے بہرہ مند ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا کلام شعور سے اور شعر شعریت سے خالی نہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ تخلیقی کرب جھیلنے کے بعد لفظوں کا معتبر ٹھہرنا یقیناً اس کے لیے وسیلۂ راحت بنتا ہے۔ اس کی شاعری بادِ صبا کی گود میں کھیلنے والا بہت خوبصورت پھول ہے کہ جس کی مہک روز افزوں ہے۔

احمد نواز نے حمد و نعت، قصیدہ، سلام اور منقبت کے علاوہ قطعہ، ثلاثی، گیت نگاری، نظموں اور بالخصوص غزلوں کی صورت میں اپنی ذات کا آبرومندانہ اور شاندار اظہار کیا ہے۔ فنِ شعر گوئی میں اس نے جو خوبی پائی ہے، وہ دیدنی ہے۔ اس نے عصرِ حاضر کی غزل کی فضا میں اپنے منفرد اور دلفریب رنگ بکھیر کر اس کے حسن اور جاذبیت میں اضافہ کیا ہے۔

ذیل میں احمد نواز کے کلام سے منتخب اشعار اور چند غزلیں پیش ہیں کہ جن سے اس کی شعری کائنات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ غزلیہ شاعری کے بعد احمد نواز کی نظم کی اڑان، اُپج اور اُسلوب کے تعارف کے طور پر ان کے منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

کچھ نہ ہوتا جو ماورائے نظر
آنکھ بے موت مر گئی ہوتی
کہا تھا کس کو تُو نے ''کُن'' خدایا!

کوئی تو تھا جو تیرے دھیان میں تھا
زندگی کے زنداں میں جبر کی حکومت ہے
آدمی کی آزادی ناتمام حسرت ہے
بند ہو کے کھلتی ہے آنکھ دیکھنے والی
ایک عمرِ لاحاصل آگہی کی لاگت ہے
ڈر ہی ہر اک فرد کا دُشمن، ڈر ہی پہرہ دار ہے
آسانی کے دور میں جینا کس درجہ دشوار ہے

احمد نواز کی شاعری پر ایک نظر ڈالیں تو صاف پتا چلتا ہے کہ وہ نُدرت اور جدّت کا بہترین امتزاج ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شعریت کو انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مضامین کا تنوع الگ ہے۔ ان کے بے ساختہ اور رواں اشعار سادہ الفاظ سے بنی اور پڑھی جانے والی شاعری بھی منفرد اسلوب کے باعث لطف دیتی ہے۔ جدید اور موجودہ شعراء میں احمد نواز ایک پُر امکان شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں دل و دماغ کو معطر کرتی ہیں۔ ہر شعر، ہر مصرع دل کشید کرتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے تخیل میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ جو ان کی شاعری میں اثر آفرینی کا باعث ہے۔

ایک صورت ہے کہ بچ جائے یہ دنیا احمد
خواب ہر آنکھ کو، پھر خواب کو تعبیر ملے(۱۱)

حوالہ جات

۱۔ شورش کاشمیری، بحوالہ سید ضمیر جعفری۔ ایک عہد ایک تاریخ تحریر۔ سیدّ حسن رضا جعفری، مشمولہ::https//jang.com.pk/news/97989، ۱۲مئی ۲۰۱۶ء

۲۔ ضمیر جعفری، سید، روحِ غزل، پچاس سالہ انتخاب، مرتبہ: پروفیسر مظفر حنفی، الٰہ آباد: انجمن روحِ ادب، ۱۹۹۳ء، ص: ۲۴۳

۳۔ حسن رضا جعفری، سید ضمیر جعفری۔ ایک عہد ایک تاریخ، ۱۲مئی ۲۰۱۶ء

۴۔ ضمیر جعفری، سید، نشاطِ تماشا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص: ۶۷

۵۔ ضمیر جعفری، سید، نہ معلوم منزل کی طرف، مشمولہ: اردو پنچ، فکاہی ادب کا مخزن، جلد نمبر ۹، جولائی۔اگست ۱۹۹۰ء، ص: ۲۱۸

۶۔ صدیق کلیم، پروفیسر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، دسویں جلد، ۱۹۷۲ء ص: ۴۲۹

۷۔ ضمیر جعفری، سید، نشاط تماشا، ص: ۹۱۰

۸۔ شہزاد نئیر سے ایک ملاقات، انٹرویو از آصف اے شیخ، ابو سلیمان، مشمولہ: سرخ چنار، ماہنامہ، شمارہ نمبر ۸، اگست ۲۰۱۱ء، لاہور: ص: ۳۸

9. https//:ur.m.wikipedia.org امجد اسلام امجد

10. https//:ur.wikipedia.org/wiki/

۱۱۔ احمد نواز، اشک گویا، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، مارچ ۲۰۱۱ء، ص: ۱۵۸

☆......☆......☆